جنید احمد قاسمی: اور ان کی عربی سوانح نگاری

عبدالوہاب قاسمی
''اقرأ پبلک اسکول''، حق نگر، سوراپور، سیوان (بہار)
رابطہ:7631677978

ذہنوں کی تجلیوں میں جب افکار منور ہوتے ہیں تو تخلیق، تحقیق اور تنقید کی بہت سی منجمد سطحیں متحرک ہوجاتی ہیں۔ کچھ ایسا ہی احساس ہوا جب مفتی جنید احمد قاسمی صاحب کی کتاب ''العلامه المحقق السید مناظراحسن الکیلانی:حیاته و مآ ثره'' پر نظر پڑی۔

مصنف کے شخصی خاکے کا رنگ و آہنگ زمانۂ طالبِ علمی سے ہی ذہن پر نقش ہے۔ کیونکہ ہم نہ صرف ایک گاؤں کے باشندہ ہیں بلکہ ایک ہی مدرسے میں تحصیلِ علم کے کچھ ایام بھی ساتھ بتائے ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنی منفرد خصوصیات اور عادات واطوار سے توجہ کا محور رہے ہیں۔۔ وہ ایک محنتی اور محبوب شاگرد کے طور پر اساتذہ اور طالب علموں کے درمیان پہچانے گئے۔ اساتذہ کی قدردانی اور عظمت ان کے دل میں ہمیشہ رہی اور شروع سے ہی بزرگوں اور اہلِ علم کے قدرشناس رہے ہیں جو قلبی شغف کی حد تک ان میں موجود تھی۔ زانوے تلمذ تہہ کرتے ہوئے انھوں نے عاجزی وانکساری اور فروتنی وخاکساری کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ اللہ نے انھیں اچھی ذہانت سے نوازا ہے اس لیے نکتہ آفرینی کے ساتھ استحضار کی نعمت سے بھی وہ مالا مال ہیں اور اس سے خوب تر استفادے میں آج بھی وہ مصروف ہیں۔

انھیں زمانۂ طالبعلمی سے ہی درسی کتب بینی کے علاوہ دیگر کتب کے مطالعہ کا ذوق وشوق وافر مقدار میں رہا ہے۔ یہ مطالعہ اکثر اساتذہ کے ذریعے منتخب شدہ کتابوں کا رہتا؛ اس لیے

وہ سطحی اور غیر معیاری کتابوں کے مطالعے سے دور رہے۔ایک ایک موضوع پر مختلف کتابیں ان کے زیرِ مطالعہ رہتیں۔وہ اکثر دورانِ مطالعہ قیمتی باتوں، نئے نکتوں اور پہلوؤں کے تراشے اپنی مخصوص ڈائری میں لکھتے۔کبھی محاورہ، کبھی خوبصورت جملے، کبھی تاریخی حقائق، کبھی نصیحت آموز واقعہ، کبھی حاشیے کے نوٹ اور کبھی............گویا ان کی حالت یہ تھی۔

سرورِ علم ہے کیف شراب سے بہتر
کوئی رفیق نہیں کتاب سے بہتر

مطالعے کی دولت سے جو علمی وسعت جنید احمد قاسمی کو نصیب ہوئی اس کا عملی اظہار زمانۂ طالبعلمی ہی سے صفحۂ قرطاس پر ایک انفرادی اسلوب وادا میں ہونے لگا۔کئی تحریری مسابقے ان کے نام رہے اور بہت سے تقریری مقابلے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ان کی تحریر کا جادو سر چڑھ کر بولتا رہا۔دارالعلوم دیوبند تک جاتے جاتے ان کے کئی مضامین اور مقالے معتبر رسائل کی زینت بن چکے تھے۔انھوں نے اب تک اردو میں تین سو سے زائد مضامین ومقالات مختلف موضوعات پر لکھے ہیں جن میں کچھ اہم مضامین بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں''اور ہم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر''''حضرت مجدد الف ثانی :حیات او ر کارنامے''''حضرت شاہ ولی اللہ :حیات و خدمات''''مخلوط تعلیم شریعت کی نظر میں''''امن عالم اور اسلامی تعلیمات''''مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی صاحب: حیات وکارنامے''''علوم اسلامی کے میدان میں مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی خدمات'' ''مخطوطات فتح القدیر کا تحقیقی جائزہ''''علم حدیث کے باب میں مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی امتیازی خدمات'' اور''عالم کسے کہتے ہیں''جیسے مضامین ومقالات ان کی علمی حیثیت کو ہمارے سامنے لاتے ہیں۔

اردو مضمون نویسی کے ساتھ عربی مضمون نویسی کا بھی عمدہ ذوق شروع دنوں سے ہی رہا ہے-جس میں دارالعلوم دیوبند کے خصوصی شعبے تکمیلِ ادب اور تخصص فی الادب نے چار چاند لگا دیے۔اس کی زندہ اور تابندہ مثال موصوف کی یہ کتاب ہے۔جو ہمیں اس نوجواں، کم عمر مگر پختہ قلم کار کا معترف بناتی ہے۔

مذکورہ پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے کتاب کا مطالعہ کریں تو یہاں موصوف کا اپنا انفرادی رویہ سامنے آئے گا۔ یہ کتاب حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی پر لکھی گئی مختصر اور طویل تحریروں سے کئی سطحوں پر منفرد نظر آتی ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی علمی، ادبی اور دینی شخصیت کا ایک جہاں معترف ہے۔ اکابرین علما نے ان کی علمی شخصیت کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ مولانا کی علمی شخصیت کئی پہلوؤں کو محیط تھی۔ وہ بیک وقت مفسر، محدث، فقیہ، مؤرخ، متکلم، فلسفی، معلم، مصنف، مرتب، مترجم، سوانح نگار، سیاست کے رمز آشنا، محقق، صحافی اور صاحب طرز انشا پرداز ادیب تھے۔ انھوں نے شاعری بھی کی اور خطابت کا جادو بھی جگایا۔ اللہ نے ان کی شخصیت کو علمی طلسمات کا نگار خانہ بنا دیا تھا۔ مولانا کی اس علمی شخصیت کے پیچھے ان کے اساتذۂ کرام کی صحبت خاص کا اہم کردار تھا۔ سید العلماء مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی، علامہ معین الدین اجمیری، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیو بندی اور علامہ انور شاہ کشمیری کے فیضانِ نظر نے مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی شخصیت میں علمی و فنی خصائص اور فکری کمالات پیدا کیے۔ مولانا کی تصنیفات و تالیفات ان کے کمالات کی منہ بولتی تصویریں ہیں جن میں مولانا کے مطالعے کی وسعت، ان کا تنوع، خیالات کی ندرت، نکتہ سنجی، ذہنی اپج اور اخذ و اکتساب کی انفرادی صلاحیت کے زاویے روشن ہیں۔ جس موضوع پر انھوں نے قلم اٹھایا علم کا دریا بہا دیا۔ ان کی تصانیف میں ''ابوذر غفاری''، ''النبی الخاتم''، ''الدین القیم''، ''اسلامی معاشیات''، ''مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت''، ''تدوین حدیث''، ''مقدمہ تدوین فقہ''، ''تذکرہ شاہ ولی اللہ'' اور ''سوانح قاسمی'' کو فراموش کرنا علمی دنیا کے لیے آسان نہیں۔ یہ ایسی تصانیف ہیں جن سے برسوں استخراج و تحقیق میں مدد لی جاتی رہے گی۔ ان کے تعلق سے حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے یہ گراں قدر خیالات ملاحظہ ہوں:

> ''انھوں نے اپنی کتابوں میں جو مواد جمع کر دیا ہے۔ وہ بیسیوں آدمی کو مصنف اور محقق بنا سکتا ہے۔ اس ایک آدمی نے تن تنہا وہ کام کیا ہے جو یورپ میں پورے پورے ادارے اور منظم جماعتیں کرتی ہیں۔ ان جیسا

آدمی برسوں میں پیدا ہوا تھا اور اب ان جیسا آدمی شاید برسوں میں بھی
پیدا نہ ہو‘‘ (پرانے چراغ: ج اول: ص۹۴)

مولانا کی دینی شخصیت بھی بہت مسحور کن تھی۔ اللہ نے انھیں گداختگیٔ قلب سے نوازا تھا۔ اخلاق وسیرت اور عادات وکردار میں ولی اللہی شان کے مالک تھے۔ انکساری، خاکساری اور عاجزی ان کا جوہر خاص تھا۔ عبادت و ریاضت کے وہ پابند تھے۔ اوروردو وظائف ان کا معمول تھا۔ وہ حسنی وحسینی سادات کے جس خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس کی روحانی خوشبو مولانا میں منتقل ہوگئی تھی۔ تصوف کے باب میں انھوں نے جو کچھ لکھا اس میں اسی روحانیت کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔

سچائی یہ ہے کہ ایسی جامع کمالات شخصیت کا تعارف ان کے شایان شان اب تک نہیں ہو سکا ہے۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری نے اپنی کتاب ’’مولانا سید مناظر احسن گیلانی: شخصیت اور سوانح‘‘ کے پیش لفظ میں اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

’’مولانائے گیلانی ایک جامع الصفات اور نادرِ روزگار شخصیت تھے۔ ان کا شمار نابغۂ عصر اور ذہین ترین علماء میں ہوتا تھا۔ اہل علم اور اصحاب نظر نے ان کے ان اوصاف وکمالات کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن ان کے شایان شان علمی کام ابھی تک سامنے نہیں آیا ہے۔ مولانا محمد ظفیر الدین مفتاحی نے حضرت علام پر ایک نہایت مفید کتاب تالیف فرمائی ہے لیکن وہ صرف کام کا آغاز تھا۔ افسوس کہ حضرت گیلانی کی وفات کے بیالیس برسوں میں وہ پہلا ہی نہیں آخری کام بھی تھا‘‘ (ص:۲)

مولانا گیلانی پر قلم اٹھاتے ہوئے مفتی جنید احمد قاسمی کو بھی اس کا شدید احساس رہا ہوگا اسی لیے انھوں نے اپنی کتاب میں جو طرز اپنایا ہے وہ اوروں سے بہت کچھ مختلف ہوتے ہوئے ایک ایسی زبان میں ہے جو:

’’چار سو بائیس ملین عربوں کی قومی اور ایک ہزار ملین مسلمانوں کی مذہبی

زبان ہے۔ یہ ۲۱؍ممالک کی پہلی اور پانچ ملکوں کی دوسری سرکاری زبان ہے''   (ادب امکان:ص ۶۳)

عربی زبان سے اہلِ ہند کے تعامل وترابط کی کڑیاں صدیوں سے مربوط ہیں۔عربی سے اردو اور اردو سے عربی کے مترجمین نے مابین فکری اور تہذیبی فاصلوں کو کم کیا ہے اور شناسائی کی نئی راہیں تلاش کی ہیں۔ یہ سلسلہ عہد قدیم سے آج تک جاری ہے۔ ماضی میں بہت سی ایسی کتابیں رقم کی گئی ہیں جن سے باہمی رشتوں کا سراغ ملتا ہے۔''تحقیق ماللہند''''طبقات الامم''''سلسلۃ التاریخ'' ''مروج الذہب''اور''سبحۃ المرجان''وغیرہ عربی زبان کی ایسی کتابیں ہیں جن میں ہندوستان کے تاریخی آثار و باقیات، جغرافیائی منطقے، علوم ومعرفت کی عبارتیں اور یہاں کی عظمتوں کے حوالے قلم بند کیے گئے ہیں۔اردو نژاد اہلِ علم نے بھی عربی زبان میں جو تصنیفی وتالیفی خدمات انجام دی ہیں انھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔تفسیر، حدیث، فقہ، عقائد، تاریخ، لغت اور ادب وشاعری میں ان کی عربی تصنیفات کو اہلِ عرب نے قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور سراہا ہے۔

تذکرہ نویسی اور سوانح نگاری میں بھی علمائے ہند نے نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں۔''نزہۃ الخواطر''(مولانا عبدالحسنی)''نفحۃ العنبر فی حیاۃ الشیخ الانور''(مولانا یوسف بنوری)''محمد انور شاہ الکشمیری''(مولانا بدرالحسن قاسمی)''رجال السند والہند''(قاضی اطہر مبارکپوری)''حیاۃ الصحابہ''(مولانا یوسف کاندھلوی)اور''الصحابۃ ومکانتہم فی الاسلام''(مولانا نورعالم خلیل الامینی)جیسی تصنیفات عربی سوانح کی روشن کڑیاں ہیں۔مقامِ مسرت ہے کہ ایک نو عمر اور جواں سال قلم کار نے بڑے اعتماد کے ساتھ تذکرہ اور سوانح کی اس فہرست میں ایک اور اضافہ کردیا اور ترابط کی ایک سبیل پیدا کی ہے۔

''العلامہ المحقق السید مناظر احسن الکیلانی: حیاتہ و آثرہ''دوحصوں میں منقسم ہے۔ مصنف نے نو ابواب کے ساتھ تیس ذیلی عنوانات قائم کرکے تمام جزئیات کو سمیٹنے کی عمدہ جستجو کی ہے۔ پہلے حصے میں حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی زندگی پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور

چھوٹے بڑے، سبق آموز اور قابلِ تقلید تمام جزئیات واقعات کو شامل کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں ان کے علمی کارناموں کو جگہ دی گئی ہے۔ مقدمہ کے ساتھ خاتمہ بھی کتاب کا حصہ ہے۔

مفتی جنید احمد قاسمی نے کتاب پر جو مقدمہ لکھا ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے ان کے شاداب اور زرخیز ذہن کا پتہ چلتا ہے۔ یہ مقدمہ مربوط اور منظّم انداز میں تحریر کیا گیا ہے جو کتاب کے محتویات کا بھرپور تعارف پیش کرتا ہے اور سوانح نگار کے ذہنی، تخلیقی اور تنقیدی رویے کا عرفان عطا کرتا ہے۔ انھوں نے اپنے کام کی بنیاد جن اصولوں پر رکھی ہے اور جو طریقہ اپنایا ہے انھیں سمجھے بغیر کتاب کی مکمل تفہیم نہیں ہو سکتی اس لیے یہ مقدمہ تفہیم کی پہلی سیڑھی ہے۔ یہ مقدمہ نہیں ہوتا تو شاید بہت سے مقامات پر ہم الجھن کے شکار ہو جاتے۔ آج ایسے لکھنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے جنھیں کتاب کی غرض و غایت اور اہمیت و افادیت کا پتہ تک نہیں ہوتا اور وہ خود اپنے کام کا صحیح تعارف پیش کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ مگر مفتی جنید احمد قاسمی نے ان نئے لکھنے والوں میں اپنی راہ الگ بنائی ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی پر اردو میں لکھے گئے مضامین، کتابچے اور مستقل کتاب سے اردو داں طبقہ کسی نہ کسی حد تک آشنا ہو جاتا ہے۔ مگر آج تک ایک اندازہ کے مطابق ایسی عبقری شخصیت پر عربی زبان میں چند صفحات بھی موجود نہیں جنھیں ہم اہلِ عرب کے سامنے فخریہ پیش کر سکیں۔ اس نظریے سے غور کریں تو اس کتاب کی حیثیت نقشِ اول کی بنتی ہے اسی لیے سوانح نگار نے اس کی اہمیت و افادیت کے پیشِ نظر بہت سے ایسے منجمد گوشوں کو متحرک کیا ہے جن پر اب تک خاموشی تھی۔ یہ انجانے پہلو بعض مخفی اور انوکھے واقعات کی طرف ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ ایسے پہلوؤں تک پہنچنے کے لیے ایک اضطراب آسا ذہن کی ضرورت ہوتی ہے جو مفتی جنید احمد قاسمی کے پاس ہے۔ انھوں نے سابقہ مواد پر ارتکاز یا الٹ پلٹ کر محض تصنیفی آرزو پوری نہیں کی ہے بلکہ فکر و نظر کے تیل بھی ٹپکائے ہیں۔

سوانح نگاری کے اپنے اصول اور قاعدے ہیں۔ یہ کسی شخصیت کی زندگی کا وہ آئینہ ہے جس میں متعلقہ شخصیت کی زندگی کے پہلو منعکس کیے جاتے ہیں۔ نادیدہ گوشوں اور منجمد زاویوں

سے شخصیت کے تار و پود جوڑے جاتے ہیں۔ شخصیت جس پایے کی ہوگی ان کے سوانحی جز ئیات بھی اسی قدر رہوں گے۔ اب یہ سوانح نگار کی نظر وانتخاب کا کمال ہے کہ وہ کس طرح ان جز ئیات سے گہر تلاش کرتا ہے۔ ایک کامیاب سوانح نگار وہ ہے جس کی آستین میں روشنی کا سیلاب ہو اور جو ایسی کھوئی ہوئی حقیقتوں کا انکشاف کرے جو قاری کی حیرتوں کو جگائے۔ صاحب سوانح کے سینکڑوں واقعات کے انتخاب میں بڑی مشکل یہ ہوتی ہے کہ کسے جگہ دی جائے اور کسے چھوڑ دیا جائے لیکن ایک اچھا اور گہری نظر کا حامل سوانح نگار یہ مرحلہ اپنی بصیرت اور شعور سے طے کر تا ہے۔ سوانح نگار کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ صاحب سوانح سے عقیدت کی حد تک متاثر ہو۔ وہ صاحب سوانح سے ہمدردی، خلوص اور رواداری کا رویہ اپنائے اور ہر طرح کے تعصّبات سے پاک ہو۔ ورنہ اس کی کتاب واقعات کی کتھونی کے سوا کچھ نہ رہے گی۔ جس میں نہ قربت کی گرمی محسوس ہوگی، نہ جامع اور ہمہ گیر شخصیت لفظوں میں اتر پائے گی۔ کیوں کہ بغیر عقیدت کے کوئی کسی پر سینکڑوں صفحات کیوں کر دلجمعی کے ساتھ لکھ سکتا ہے؟ مگر یہ عقیدت واقعات کے انتخاب میں اس قدر اثر انداز نہ ہو کہ اعتبار، استناد اور استدلال کے پہلو پیچھے رہ جائیں بلکہ تمام حقائق دلائل کی روشنی میں آشکار ہوں۔

مذکورہ اصولوں کی روشنی میں دیکھیں تو مفتی جنید احمد قاسمی نے اپنی کتاب کو ان اصولوں سے آراستہ کیا ہے۔ ان کا انداز ہر جگہ معروضی ہے۔ انھوں نے اس سوانح کو مستند، معتبر، علمی، کارآمد اور مفید بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ معروضیت اور اظہار میں اعتدال پسندی نے اس سوانح کو محترم بنا دیا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ عربی میں ایک بھی تحریر مولانا مرحوم پر موجود نہیں تھی۔ ایسے میں لامحالہ سوانح نگار کو ان مآخذ سے مدد لینی پڑی جو اردو زبان میں تھے۔ مگر عقیدت اور نگاہ عشق و مستی میں انھوں نے اپنے مآخذات کے تمام ذروں کو ستارہ متصور نہیں کیا بلکہ مستند مآخذ پر ہی اعتبار کیا ہے۔ کتاب میں کوئی بھی بات بغیر حوالے کے نہیں کہی گئی ہے۔ جن کتابوں کے حوالات درج کیے گئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اعتماد و اعتبار کے بنیادی اصولوں کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ مثلا: جس مکتبے سے کتاب چھپی ہے، اس کا علمی دنیا میں کیا وزن ہے؟ ناشر کا عقیدہ و

مسلک کیا ہے؟ پیش نظر کتاب میں کو جو کچھ اضافہ کیا گیا ہے کیا دیگر ذرائع سے اس کی تصدیق ہوتی ہے؟ اور کیا وہ صاحب سوانح کے مزاج و منہاج سے مطابقت رکھتا ہے؟ یا علمی دنیا میں اسے کس نظریے سے دیکھا جاسکتا ہے؟ اسی طرح انھوں نے صاحب سوانح کی کتابوں پر جو وضاحتی نوٹس لکھے ہیں وہ ان کی تحقیقی بصیرت کا شعور عطا کرتے ہیں۔ جو باب گیلانی میں نیا اضافہ ہے۔ اصل کتاب میں جو کچھ تاریخی پیچیدگیاں تھیں ان پر سوانح نگار کا محققانہ تبصرہ کتاب کی اہمیت بڑھا تا ہے۔ صفحہ (۲۱) پر مولانا کی جائے پیدائش کی تحقیق کے ساتھ دیگر مقامات پر بھی انھوں نے تحقیقی شعور سے کام لیا ہے۔ کتاب کو مکمل استنباطی پیکر دیا گیا ہے۔ نقل حوالات کے ساتھ معتبر کتابوں سے مدد لے کر حاشیہ نگاری کی گئی ہے۔ اکتالیس میں سے تقریبا ۲۸ر کتابوں کا تعارف کراتے ہوئے کتاب میں آمدہ گنجلک و تفصیل طلب الفاظ و عبارت کی مدلل وضاحت کی گئی ہے۔

مفتی جنید احمد قاسمی نے اس کتاب میں ایک نیا پہلو یہ بھی شامل کیا ہے کہ حضرت گیلانی کے اساتذہ کے ساتھ ان کے اہم شاگردوں کو اپنا محور بنایا ہے۔ جو اپنے آپ میں ایک مشکل کام ہے۔ اس پہلو پر مولانا کے سوانح نگار میں سے کسی کی نظر نہیں گئی۔ اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ قاری کو حضرت گیلانیؒ کے علمی فیوض و برکات کے تعین قدر میں آسانی ہوگی۔ ڈاکٹر حمید اللہ حیدرآبادی، ڈاکٹر غلام دستگیر رشید، غلام محمد اور مخدوم محی الدین جیسی علمی شخصیات کو مولانا گیلانی کے شاگرد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ پر تو تفصیلات موجود ہیں لیکن ان کے علاوہ پر لکھنا آسان نہ تھا کہ مواد کی عدم فراہمی یہاں حائل تھی۔ پھر بھی مفتی جنید احمد قاسمی نے اپنی جستجو بھر ان کی یکجا تصویر کشی کی ہے جس سے مولانا کے علمی سلسلے کی روشن کڑیاں سامنے آگئی ہیں۔

مفتی جنید احمد قاسمی نے کتاب لکھتے ہوئے اپنے مولانا سے مکمل خلوص کا ثبوت دیا ہے۔ انھوں نے اس راہ میں آنے والے تمام مشکلات و رکاوٹ کا سامنا اسی خلوص کے ساتھ کیا ہے۔ خصوصا تحقیقی مقامات پر جن صبر آزما حالات سے وہ گذرے ہیں ان کا احساس کتاب پڑھ کر ہی ہوتا ہے۔ زمانہ طالبعلمی سے ہی سوانح نگار مولانا کے عقیدت مند تھے۔ ان کی کتابوں کا مطالعہ بڑے شوق سے کرتے اور نجی محفلوں میں بھی مولانا کے ذکرِ خیر سے وہ نہیں چوکتے۔ اسی

عقیدت اور جذباتی وابستگی سے یہ کتاب ایک یادگار بن گئی ہے۔

مفتی جنید احمد قاسمی نے مولانا کے علمی وروحانی کمالات کے اظہار میں ارضی پہلوؤں پر بھی نظر رکھی ہے۔ اس سچائی سے انکار ممکن نہیں کہ کسی بھی انسان کی عام انسانی اور ارضی گوشوں کو نظر انداز کر کے ہم اس کا سچا تعارف پیش نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ ان میں قاری کے لیے بہت سے افادی پہلو پوشیدہ ہوتے ہیں۔ وہ کسی بھی سوانح کو پڑھتے ہوئے صاحبِ سوانح کے ان کارناموں کو تلاش کرتا ہے جو عمومی صورت حال میں صاحب سوانح کو منفرد شناخت عطا کرتے ہیں جن سے وہ ترغیب وتقلید کے مرحلے سے گذرتا ہے۔ کچھ خواب سجاتا ہے، کچھ تمنائیں پالتا ہے اور عملی میدان میں کچھ کر گزرنے کا حوصلہ اس کے اندر انگڑائی لیتا ہے۔ اس کتاب کے ذریعے سوانح نگار نے مولانا کے جو ارضی نقوش تلاش کیے ہیں وہ ہمیں اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ مولانا نے اسی زمین پر رہتے ہوئے اپنے اوقات کو بہترین مصرف میں لگایا اور بڑے بڑے کارنامے انجام دیے۔

کتاب کے تمام ابواب اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں۔ مگر سب سے اہم نواں اور دسواں یعنی آخری باب ہے یہ دونوں باب بالکل نئے انداز کی تحقیق کو سامنے لاتے ہیں۔ آدھی کتاب سے زائد حصوں پر محیط یہ باب اپنی اہمیت کا احساس دلاتے ہیں۔ یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ بعد کے لوگوں کے لیے مولانا کی اصل وراثت ان کے افکار وخیالات سے مملو ان کی کتابیں ہیں اور اہل علم اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ ان کی کتابیں عرب وعجم کے لیے یکساں مفید ہیں۔ اگر دیگر زبانوں میں ان کے ترجمے کردیے جائیں! دسواں باب انھیں کتابوں کا تعارف کراتا ہے۔ اس کو لکھتے ہوئے سوانح نگار کے پیش نظر یہ نکتہ رہا ہوگا کہ یہ کتابیں جس قدر اہم ہیں لوگوں نے ان سے اس قدر استفادے نہیں کیے۔ اسی لیے انھوں نے ان کتابوں کی اہمیت ،افادیت ،ضرورت اور عصری تقاضوں سے قاری کو آشنا کیا ہے۔ اس باب کو ہم کتاب کا نچوڑ بھی کہہ سکتے ہیں۔

مفتی جنید احمد قاسمی کا اسلوب بیان نہایت شستہ، سلیس اور رواں ہے۔ وہ عربی زبان و اسلوب کے بنیادی نکتے سے آشنا ہیں اور اس کے اسرار و رموز، نحویات، صرفیات، تشبیہات،

تلمیحات سے آگاہ ہیں۔ پوری کتاب مکمل عربی اسلوب کے ساتھ ساتھ تخلیقی قوت، زبان کی طہارت اور نزاکت کافی دل چسپ ہے۔ مفتی صاحب نے اپنے جذبات وخیالات کے اظہار میں کسی تصنع اور تکلف کے بجائے وضاحت، وثاقت اور سلاست کو راہ دی ہے۔ انھوں نے حشو وزوائد اور طول کلامی سے اپنے اسلوب کو ژولیدہ نہیں کیا اور نہ ہی بلاوجہ کی تکرار کو جگہ دی ہے۔ دھلی دھلائی زبان میں مطالب ادا کیے ہیں۔ جدید اسلوب اور آج کے ذہن و مذاق کا خیال رکھا ہے۔ مولانا جن خوبیوں کے مالک تھے ان کے پیش نظر ایسے ہی دلنشیں اسلوب میں ان کی تحلیل وتجزیہ کی ضرورت تھی جسے مفتی جنید احمد قاسمی نے بہت حد تک پورا کیا ہے۔

کتاب کی اہمیت اور مؤلف کی نیک نیتی کا یہ ثمرہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند نے اس کو اپنے اشاعتی ایجنڈے میں شامل کیا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ دارلعلوم دیوبند کا کسی کتاب کو اشاعت کے لیے قبول کرنا کس قدر اعزاز کی بات ہے۔ یہاں عام سرکاری اداروں کی طرح جوڑ توڑ، اپنوں پر نظرِ عنایت اور رشوت لے دے کر کتابیں منتخب نہیں کی جاتی ہیں بلکہ پورا انحصار کتاب کی اہمیت وافادیت پر کیا جاتا ہے۔ دارالعلوم کے اس انتخاب سے نہ صرف ایک جواں سال قلم کار کے حوصلے بلند ہوئے بلکہ دوسروں کے لیے مہمیز بھی ہے۔

امید ہے کہ یہ کتاب سوانح نگار کو مستحکم شناخت عطا کرے گی اور عربی زبان میں گیلانیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے رہنما ثابت ہوگی اور جس سماج کو پیش نظر رکھ کر یہ کتاب لکھی گئی ہے اس میں شرف قبولیت نصیب ہوگی ان شاء اللہ تعالی۔

☆☆☆